آل احمد سرورؔ

دو روزہ قومی سیمینار

۲۴؍۲۵؍ فروری ۲۰۰۱ء

کلیدی خطبہ

سرور دانشور

شمس الرحمٰن فاروقی

زیر اہتمام

شعبۂ اردو، ڈی ایس اے پروگرام

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آل احمد سرورؔ

دو روزہ قومی سمینار

۲۴/۲۵/ فروری ۲۰۰۱ء

کلیدی خطبہ

سرور دانشور

شمس الرحمٰن فاروقی

زیر اہتمام

شعبۂ اردو، ڈی ایس اے پروگرام

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱

سب سے پہلے تو میں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اس بات کی مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے اس سمینار کا اہتمام کیا اور اس طرح ساری دنیائے اردو پر سرور صاحب کا جو حق ہے اسے ایک حد تک ادا کرنے کی کوشش کی۔ میں اس بات کے لیے شعبۂ اردو کا ممنون ہوں کہ اس تاریخی سمینار کا کلیدی خطبہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔

یہ ۱۹۶۴ء یا ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ سرور صاحب الہ آباد تشریف لائے۔ حسب معمول ان کا قیام اعجاز صاحب کے یہاں تھا، اور حسب معمول اعجاز صاحب مرحوم نے شام کو سرور صاحب کے اعزاز میں ایک جلسہ قائم کیا جس میں شہر اور یونیورسٹی کے بہت سے لوگ شریک ہوئے۔ سرور صاحب نے اس موقعے پر اپنے مخصوص، دلنشیں اور ٹھہرے ہوئے انداز میں ایک طویل تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ جدید شعرا نے کائنات کی جگہ ذات کو اپنے افکار کی جولانگاہ بنالیا ہے۔ انھیں شکایت تھی کہ معاصر شعرا کو خارجی حقائق سے دلچسپی نہیں رہ گئی ہے، وہ اپنے ہی دکھ درد کا بیان کرنے اور اپنے ہی زخموں کا شمار کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کی دروں بینی نے انھیں دنیا سے دور کر دیا ہے۔ اس طرح جدید شاعری معاصر دنیا کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوتی جارہی ہے۔

سرور صاحب نے تقریر ختم کی تو چند لمحے کے لئے خاموشی رہی۔ ان کی گفتگو اتنی مربوط اور باتیں اتنی چبھتی ہوئی تھیں کہ سب اس امید میں خاموش تھے کہ کوئی اور پہل کرے تو جدید شاعری کی طرف سے باب جواب کھلے۔ بالآخر میں ہی نے ہمت کی اور سرور صاحب کی توجہ اس ادبی صورت حال کی طرف منعطف کی جو انیسویں صدی کے اواخر سے مغرب کے ادب میں اور ترقی پسند ادب کے زوال کے بعد سے ہمارے ادب میں جاری تھی۔ میں نے عرض کیا کہ طاقت اور دولت کی پرستار مادّہ پرست تہذیب نے شعرا سے اپنا سروکار منقطع کرلیا ہے۔ شاعر اسے راہِ راست پر لانا چاہتا ہے لیکن دنیا

اس کی سنتی نہیں۔ میں نے انھیں ورلن کے الفاظ یاد دلائے۔

the world, whom the poets, profound words have troubled, banishes the poets. They in their turn banish the world.

میں نے التماس کیا کہ اصل معاملہ یہی ہے کہ اب دنیا، کائنات، معاشرہ، جو بھی کہیں، ان میں اور شاعر کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں رہ گئی ہے۔ ایسی صورت میں اگر شاعر اپنی ہی ذات اور اپنے ہی وجود میں پناہ نہ لے تو کیا کرے۔ میں بڑی دیر تک اپنی دھن میں بولتا گیا اور سرور صاحب مسکرا مسکرا کر سنتے رہے۔ پھر انھوں نے میری باتوں کا جواب بھی دیا۔ ان کی جوابی باتیں تو اب ذہن سے محو ہو گئی ہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ سرور صاحب کے جواب میں کوئی جارحیت اور ان کے لہجے میں کوئی کبیدگی نہ تھی۔ یہ میرا ان کا پہلا سامنا تھا، اس لئے اغلب ہے انھوں نے مجھے کوئی جونیر لکچرر یا سال خوردہ ریسرچ اسکالر سمجھا ہو۔ لیکن میرے تیز ردعمل کو انھوں نے سوے ادب سے تعبیر نہ کیا۔ یا تو انھیں اپنی رائے کی اصابت کا اس قدر اعتماد تھا کہ انھوں نے میری باتوں کو ایک دکھی دل لیکن کم تجربہ کار دماغ کی سادہ لوحی کے سوا کچھ اور نہ تعبیر کیا، یا پھر ان کے ذہن میں اتنی وسعت تھی کہ وہ مخالف نقطۂ نظر کو اگر قبول نہ بھی کرتے تو برداشت ضرور کر سکتے تھے۔

اس کے چند ماہ بعد میرا علی گڈھ جانا ہوا تو میں نے سرور صاحب کے یہاں حاضری دی۔ ان دنوں میری میک کارتھی (Mary Mac Carthy) کے ناول The Grop کا بہت چرچا تھا۔ اس میں امریکہ کے مشہور نسواں کالج ویسر Vassar کی پڑھی ہوئی (میری میک کارتھی بھی وہیں کی پڑھی ہوئی تھی) آٹھ لڑکیوں کے حالات و تجربات بیان کئے گئے تھے۔ اس کتاب کا انگلستان میں خاص طور سے ذکر ہو رہا تھا کہ اس میں عورتوں کے مسائل، مثلاً بچوں کو دودھ پلانا، مانع حمل وسائل کا استعمال، اور اس طرح کی باتیں مذکور تھیں جو ان زمانوں کے لئے نئی تھیں۔ اس بار بھی سرور صاحب سے

اردو ادب پر بات چیت نہ ہوئی بلکہ مغربی ناول پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ اسی دوران The Grop کا تذکرہ نکلا۔ مجھے وہ ناول پسند نہ تھا اور میں نے اپنا خیال بے تکلف پیش کیا کہ اس میں معمولی باتوں کو گھما پھرا کر کہنے کا انداز مجھے کچھ جنچا نہیں۔ سرور صاحب پھر اپنی مخصوص نرم مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''کوئی بات نہیں، آپ کو یہ گھماؤ پھراؤ اچھا نہیں لگا، مجھے تو اس میں بڑا مزا آیا''۔

اس ملاقات پر کئی سال گذر گئے۔ اس اثنا میں سرور صاحب سے میری یاد اللہ خاص گہری شناسائی میں بدل چکی تھی۔ کئی باتوں میں میرا ان کا اختلاف ویسا ہی تھا، لیکن میری طرف سے نیازمندی اور ان کی طرف سے شفقت پہلے سے زیادہ تھی۔ نظیر اکبر آبادی کے وہ ہمیشہ سے قائل تھے اور نظیر مجھے کبھی ایک آنکھ نہیں بھائے۔ (مجھے بعد میں ان کی خودنوشت سے معلوم ہوا کہ نظیر اکبر آبادی کے بارے میں رشید صاحب کی بھی رائے اچھی نہیں تھی۔) میں نے اپنے مضمون ''نظیر اکبر آبادی کا کائنات'' میں نظیر کو اہم لیکن خراب شاعر ٹھہرایا تھا۔ سرور صاحب کی نظر سے وہ مضمون گذرا، لیکن انھوں نے مجھے بحث میں الجھانا مناسب نہیں سمجھا۔ شاید وہ سمجھ چکے تھے کہ اس معاملے میں میری اصلاح ممکن نہیں۔

اب جو واقعہ سنانا چاہتا ہوں اس کا سال وقوع اس وقت ٹھیک سے یاد نہیں، لیکن ۱۹۷۸ کے بعد کی بات ہے۔ علی گڈھ میں اقبال پر سمینار تھا۔ ایک جلسے میں نشست اتفاقاً کچھ ایسی واقع ہوئی کہ میں سرور صاحب کے پاس بیٹھا تھا اور مجھ سے ایک دو جگہ ہٹ کر سردار جعفری تھے۔ سرور صاحب نے ایک پرچے پر کچھ لکھ کر پرچہ میری طرف بڑھایا کہ تم پڑھ لو اور پھر سردار جعفری کو دے دو۔ میں سمجھا تھا کہ کسی بات کی یاد دہانی کر رہے ہوں گے لیکن پرچے پر نظر ڈالی تو دو شعر کا فی البدیہہ قطعہ تھا۔ اس کا دوسرا شعر مجھے یاد رہ گیا ہے:

سرور اس واسطے سردار سے مجھ کو محبت ہے
کہ ہم دونوں ہیں گو مجرم مگر مجرم ہیں اقبالی

سردار جعفری نے پرچہ دیکھ کر سرور صاحب کو آداب کیا اور سرور صاحب حسب معمول مسکرا دیے۔ مجھے اس قطعے میں علمی روشن خیالی، اور مد مقابل کے اوصاف حسنہ کی تحسین کا وہ انداز نظر آیا جو سرور صاحب کے بعد شاید مفقود ہو جائے۔ ملحوظ رہے کہ سردار جعفری ایک عرصے تک اقبال کے قائل نہ تھے، کہ ترقی پسند شعریات کا یہی تقاضا تھا۔ اور سرور صاحب ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو ملک کی تقسیم کے فوراً بعد کے بھی زمانے میں، جب اکثر لوگ اقبال کا نام لیتے ڈرتے تھے، بے دھڑک اقبال کے گن گاتے تھے۔ ان اشعار میں برسوں کی ہم رکابی، اور ادبی مشرب میں اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے مسلک کا احترام تھا، ایک گونج اور خوشبو تھی اس ادبی زندگی کی جو چار دہائیوں پر محیط تھی اور جو ان دونوں بزرگوں نے الگ الگ لیکن پھر بھی ساتھ ساتھ گذاری تھی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے ان باتوں سے سرور صاحب کی دانشوری کا کیا تعلق ہے؟ لیکن میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ دانشوری کئی پہلو رکھتی ہے، اور اس کا سب سے اہم اظہار اسی حالت میں ہوتا ہے جب دانشور کو کسی ایسے علمی یا فکری موقف کا سامنا ہو جس سے وہ متفق نہ ہو۔ ایسی صورت میں اصل دانش وری یہ ہے کہ اپنی رائے کا بے کم و کاست اظہار کر دیا جائے لیکن اس بات کا احساس بھی رہے کہ فریق مخالف کی رائے کو بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ سرور صاحب اس معاملے میں لائنل ٹرلنگ (Lionel Trilling) کے ہم نوا ہیں۔ ٹرلنگ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اکثر اپنا کلاس کچھ اس طرح کی بات سے شروع کرتا تھا: "فلاں بات کے بارے میں میرا خیال یہ ہے۔ تم لوگوں کا خیال کیا ہے؟" ابھی حال میں ٹرلنگ کے مضامین کا ایک انتخاب شائع ہوا ہے۔ نیویارک ریویو آف بکس (New york Review of Books) میں کتاب کے مبصر نے ٹرلنگ کے موقف کو یوں بیان کیا ہے کہ کسی مقدمے کو اس طرح پیش کرنا کہ اس میں اختلاف کی کچھ گنجائش ہی نہیں، دراصل مد مقابل کو دھونسیانا ہے، علمی کارگذاری نہیں۔ کولمبیا میں انگریزی کا پروفیسر اینڈریو ڈیلبینکو (Andrew Delbanco) کہتا ہے:

Trilling... carried into his writing the classroom principle that stating any proposition without the least hint of doubt about its validity is a form of bullying.His Only dogma was that, pending further thought,all claims should be provisional..

ملحوظ رہے کہ مندرجہ بالا اصول اس امکان کی نفی نہیں کرتا کہ مطلق حقیقت کا وجود ثابت ہو سکتا ہے۔ اور نہ یہ اس بات کی نفی کرتا ہے کہ کوئی بھی رائے علم کا درجہ نہیں حاصل کر سکتی۔ سرور صاحب کی دانشوری کا تفاعل بھی یہی ہے کہ کسی چیز کی حقیقت کے بارے میں تمام دعوے بنیادی طور پر عارضی ہوتے ہیں۔ میتھیو آرنلڈ کی طرح سرور صاحب بھی اشیا و تصورات کا مطالعہ حتی الامکان بے غرض طور پر کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد دلا دوں کہ آرنلڈ کی اصطلاح Disinterestedness کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اچھے کو اچھا اور برے کو برا نہ کہا جائے۔ آرنلڈ کا مطلب صرف یہ ہے کہ اشیا کے مطالعے میں اشیا کو اہمیت دی جائے، اس بات کو نہیں کہ ہم ان کے بارے میں جو رائے ظاہر کریں گے اس میں ہمارا کوئی فائدہ ہے کہ نہیں۔ اسی بات کو ہیوم (Hume) نے یوں کہا ہے کہ نقاد وہ شخص ہے جو کسی فن پارے کا مطالعہ بار بار اور دیر دیر تک کرتا ہے، اور جو مختلف ملکوں کے فنون سے واقف ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد ضروری بات یہ ہے کہ نقاد اپنے ذہن کو تمام تعصبات سے صاف رکھے اور صرف اسی شے کو اپنے ادراک کا مرکز بنائے جس کا محاکمہ اسے کرنا ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ہر فن پارے کا محاکمہ کسی مخصوص نقطہ نظر ہی سے کیا جانا ممکن ہے۔ وہ لوگ، جن کی ذہنی صورت حال ان باتوں کا احاطہ نہیں کر سکتی جس کا وہ فن پارہ تقاضا کرتا ہے، تو وہ لوگ بھی نقاد کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے۔ ہیوم کے الفاظ ہیں:

A man, who has had no opprtunity of comparing the different kinds of beauty is indeed

totally unqualified to pronounce an opinion with regard to any object presented to him..

(A)..critic.. must preserve his mind free from all prejudice, and allow nothing to enter into his consideration, but the very object which is. submitted to his examination we may observe, that every work of art in order to produce its due effect on the mind, must be surveyed in a certain point of view, and cannot be fully relished by persons, whose situation, real or inmginary,is not conformable to that which is required by the performance.

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا عبارت سرور صاحب پر بھی اتنی ہی صادق آتی ہے جتنی آرنلڈ اور ٹرلنگ پر۔ ہمارے یہاں دانش ور کا مطلب عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ دانشور ہر معاملے پر اپنی رائے رکھتا ہے اور اپنے علاوہ کسی اور کی رائے کو معتبر نہیں جانتا۔ دانشور کی اصل تعریف یہ نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو ہر لال بجھکڑ کو دانشور کا مرتبہ حاصل ہوتا۔ دانشور کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہر معاملے پر اپنی سوچی سمجھی رائے رکھتا ہے، موقع پڑنے پر اس کا اظہار کرتا ہے۔ اور فریق مخالف کو بھی اپنی رائے رکھنے کا حق دیتا ہے۔ اور سوچی سمجھی رائے کے لئے شرط وہی ہے جو ہیوم نے بیان کی، کہ صرف ایک نمونے، صرف ایک مثال، صرف ایک نظام، کے مطالعے کے بل بوتے پر جو رائے قائم ہوگی وہ سوچی سمجھی نہ ہوگی۔ ہاتھی کے پاؤں کا نشان دیکھ کر لال بجھکڑ نے حکم لگایا کہ یقیناً کوئی ہرن چکی کے پاٹ پاؤں میں باندھ کر زقند لگا گیا ہے۔ لال بجھکڑ نے اگر دوسرے جانوروں کا مطالعہ کیا ہوتا تو اس سے فیصلے کی یہ غلطی سرزد نہ ہوتی۔

ریمنڈ ولیمز (Raymond Williams) نے لفظ intellectual (جس کا ترجمہ ہم "دانشور" کرتے ہیں)) کے معنی کو تاریخی اور تہذیبی تناظر میں رکھ کر یہ نتیجہ

نکالا ہے کہ شروع شروع میں جب یہ لفظ رواج میں آیا تو اس کے ساتھ تھوڑا نا پسندیدگی کا ، یا منفی تاثر تھا، مثلاً بائرن خفا ہو کر کہتا ہے (۱۸۱۳) ''کاش میں اتنا اچھا ہوتا کہ ان Intellectuals کی بات سن سکتا لیکن'' آہستہ آہستہ اس لفظ کے مرکزی مفہوم میں آزادی، یا روشن خیالی، یعنی کلیسیا (Church) اور ریاست (State) دونوں سے متعلق معاملات میں اپنی رائے رکھنا اور خود کو مروجہ فیشن یا احکام کا لازماً پابند نہ ٹھہرانا، جیسے تصورات شامل ہوگئے۔ لہذا intellectual وہ لوگ ٹھہرے جو منظم علم (organized knowledge) کا استعمال کرتے ہیں، اس غرض سے کہ عام معاملات کے بارے میں کوئی رائے یا فیصلہ قائم کریں۔ چنانچہ، بقول ریمنڈ ولیمز، دانشور طبقے کے ساتھ یہ سوال ہمیشہ منسلک رہتا ہے کہ وہ کسی بااقتدار سماجی نظام کا حصہ بن سکتے ہیں کہ نہیں؟ عام طور پر دانشور کی قدر و قیمت اسی بات پر منحصر ہوتی ہے کہ کسی بااقتدار نظام سے اس کے رشتے کیسے ہیں؟

سرور صاحب کہتے ہیں:

> دانشوری اس ذہنی صلاحیت کا نام ہے جو جذبے یا احساس کے بجائے عقل کو اپنا رہبر بناتی ہے۔ دانشور کے لئے ایک ایسا مرتب اور منظم ذہن ضروری ہے جو زندگی کے تضادات اور عجائبات میں ایک تنظیم کرتا، سمجھتا اور بنیادی اور فروعی باتوں میں فرق کر سکتا ہے..... دانش وری آدمی کو انسان بنانے کا دوسرا نام ہے۔ یہ گذری ہوئی دنیا کی معنویت، حال کی افراتفری میں صلابت اور مستقبل کے دھندلکوں میں روشنی تلاش کرتی ہے۔

سرور صاحب کا نظریہ ریمنڈ ولیمز کے مقابلے میں ذرا رومانی ہے، لیکن بنیادی بات دونوں کے یہاں ایک ہی ہے، کہ دانشور وہ ہے جو اشیا کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے علم اور تعقل کا استعمال کرے۔ سرور صاحب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ '' دانشوری میں dissent یعنی مروجہ خیالات سے انکار بھی شامل ہے۔ بلکہ بعض اوقات

تو دانش وری اسی انکار اور اختلاف، احتجاج اور حقائق کی نئی تعبیر سے پہچانی جاتی ہے۔"
لیکن وہ یہ بھی صاف صاف کہتے ہیں کہ ہندوستانی دانشوری عموماً اور اردو دانش وری خصوصاً تقلیدی رہی ہے۔ لہٰذا اس نے مغرب کے اجالوں کے ساتھ اس کی تاریکی کو بھی "مہمان عزیز سمجھ کر دل و دماغ میں جگہ دی۔" ضرورت دراصل سرور صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان کی دانشوری ہندوستانی بھی ہو، عالمی بھی، اور اسلامی بھی۔ میں سمجھتا ہوں ہیوم کے اصول کا اس سے اچھا اور درست اطلاق ممکن نہیں۔

جس مضمون سے میں نے ابھی چند جملے نقل کیے اسی مضمون میں سرور صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "جب ہاں کہنے کی لے بڑھ جائے تو انکار کی ضرورت ہوتی ہے، اور جب انکار کی لے بڑھ جائے تو ہاں کہنے کی جرأت کرنی پڑتی ہے۔ فکر روشن اس طرح زندگی میں توازن پیدا کرتی ہے اور ادھر یا ادھر میں اسیر ہونے سے بچاتی ہے۔" یہاں جو بات قابل غور ہے وہ یہ کہ سرور صاحب کے یہاں انکار برائے انکار، یا اقرار برائے اقرار کی کوئی جگہ نہیں۔ ہمارے یہاں بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی سے تنقید اور ادبی نظری فکر میں جو رجحانات نمایاں ہوئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اختلاف ضرور کیا جائے، اور اس کا اظہار سنسنی خیز انداز میں ہو اور اس طرح ادب کے قاری کو جھنجھوڑا اور چونکایا جائے۔ دوسرا رجحان یہ تھا کہ ادب کے قاری کی تربیت کی جائے اس کو ادب کا قاری نہیں بلکہ متعلم فرض کیا جائے۔ اور تیسرا رجحان یہ تھا کہ ادب کے قاری کو مطالعے میں برابر کا شریک قرار دے کر اسے اپنے خیالات میں حصہ دار بنایا جائے۔

جھنجھوڑنے اور چونکانے کا عمل بسا اوقات اپنا مقصود آپ بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے فرانسیسیوں کی اصطلاح میں epater les bourgeois کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی بات کہی جائے کہ متوسط طبقے اور معمولی تقلیدی ذہن کے لوگ بھونچکے ہو کر رہ جائیں، یا سناٹے میں آجائیں۔ یہ طور اس وقت زیادہ مقبول ہوا جب فرانسیسی اور اشتراکی فکر کے زیر اثر بورژوا کی اصطلاح یورپ میں عام ہوئی۔ یہ وقت وہ تھا جب وکٹوریہ کی طویل مدت حکومت ختم ہونے کے بعد انگریز دانشور خود کو آزاد تصور کرنے لگے تھے، کہ

ان کے خیال میں بوڑھی ملکہ کے زمانے میں اس کی رعایا پر رسومیات، مصنوعی رکھ رکھاؤ، اخلاقی قدغن اور زبان و عمل پر پابندیوں کا کھوکھلا لیکن مضبوط تسلط تھا، اسے اب خیر باد کہنا چاہیے۔ لفظ "وکٹوریائی" (Victorian) کے ساتھ ایک طرح کی بے معنی لاٹ صاحبی اور دماغی خشکی اور ریاکاری کا خیال منسلک ہو گیا تھا۔ لہذا ایسی بات کہنا یا کرنا جو وکٹوریائی عہد کے متوسط طبقے اور متوسط تقلیدی ذہن کو سناٹے میں ڈال دے، ترقی یافتگی اور آزادیِ خیال کی علامت بن گیا۔ اس کی ایک بڑی عمدہ مثال اور ورجینیا وولف کی ڈائری میں ہے کہ لٹن اسٹریچی (Lytton Strachey) ایک بار ورجینیا وولف اور اس کی بہن ونیسا بیل (Vanessa Bell) سے ملنے آیا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۸ء کا ہے جب لٹن اسٹریچی صرف ایک فیشن ایبل اور آزاد خیال ہم جنس پرست نوجوان تھا، اور اس نے Eminent victorians نامی کتاب ابھی نہ لکھی تھی جس نے واقعی سارے انگریز متوسط طبقے کو سناٹے میں ڈال دیا تھا۔ خیر، تو جب لٹن اسٹریچی ملاقات کے کمرے میں داخل ہوا تو ونیسا بیل کے لباس پر ایک ہلکا سا دھبا دیکھ کر اس نے بڑی خوش طبعی سے کہا، "اچھا، کیا یہ مادہ تولید کا دھبا ہے؟" ورجینیا وولف کچھ جھنجھلا کر اور کچھ سچ میں لکھتی ہے کہ اس ایک لفظ کے ساتھ حزم و ضبط (reserve) اور کم الفاظی و کم سخنی (reticence) کی تمام دیواریں اڑڑا دھم ہو گئیں۔

ہمارے یہاں کی تہذیب بہر حال مغرب سے مختلف ہے اور ہمارے یہاں حزم و احتیاط کا دامن کسی سے چھوٹتا نہیں۔ لیکن جب ہمارے یہاں نئے دانشوروں کا عروج ہوا تو انھوں نے بھی epater les bourgeois کا طرز اپنے طور پر اختیار کیا۔ کلیم الدین احمد صاحب مرحوم کے چند جملے آج بھی سب کو یاد ہیں۔ یا ان کے بعد محمد حسن عسکری مرحوم کے بھی بعض جملے لوگوں کے ذہن میں ہیں۔ پھر ان کی دیکھا دیکھی سلیم احمد، مظفر علی سید، وارث علوی وغیرہ نے بھی تنقید کا وہ طرز اپنایا جس کی شگفتگی اور شوخ فقروں کی چمک دمک قاری کو اپنے ساتھ لئے چلتی ہے اور اس کی حس اختلاف کو کند کر دیتی ہے۔ بلکہ یوں کہیں تو غلط نہ ہو گا کہ جب تک وہ تحریر اس کے زیر مطالعہ رہتی ہے،

قاری اپنے تعقلی استدلال کو بھی معطل کرلیتا ہے۔ ایسا نہیں کہ متوسط ذہن اور طبقے کے قاری کو بھونچکا کردینے کی طرز گذاری (Strategy) کے پیچھے کوئی سنجیدہ بات یا کوئی وقیع و متین پیغام نہ تھا۔ یقیناً تھا، لیکن جھٹکا دینے اور جھٹکا کرنے کا لطف اور ہی کچھ ہوتا ہے ۔ یہ الگ بات کہ یہ دانشورانہ لطف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرور صاحب نے دانشور کے فکر و قلم کی آزادی کے یہ معنی کبھی نہ لئے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا، قاری کی تربیت اور تدریب کا شوق، اور اسے ادب کے لطف میں حصہ دار سمجھنے کے بجائے ادب کا متعلم سمجھنے کی ادا بھی دانشورانہ تنقید کا ایک انداز ہے اور نقاد کے لئے اس میں بڑی کشش ہے۔ سب سے بڑی کشش اس میں یہ ہے کہ اس انداز کو اختیار کرکے نقاد خود کو قاری کے تئیں ذمہ داریوں سے نچنت کرلیتا ہے، کیوں کہ اگر قاری کی حیثیت متعلم کی ہے تو نقاد نہ صرف یہ فرض کرسکتا ہے کہ قاری کو کچھ نہیں آتا، بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ مہلک مفروضے میں مبتلا ہوسکتا ہے کہ میرا سروکار صرف ذہین اور چوکس طلبا سے ہے، باقی لوگ میری بات سمجھیں یا نہ سمجھیں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسا نقاد یا تو انتہائی بنیادی اور مبتدیانہ باتیں بڑے شرح و بسط سے بیان کرتا ہے، یا پھر وہ اپنے مقدمات اور مفروضات کو محض بیان کردیتا ہے، استدلال یا شہادت کی فکر اسے اس لئے نہیں ہوتی کہ ذہین طالب علم استدلال خود ہی لے آئے گا اور شہادتیں خود ہی ڈھونڈ لے گا۔ یا نہ بھی ڈھونڈ سکے تو کیا ہرج ہے، میرا کہا ہوا اس کی سند کے لئے کافی ہے۔

تیسری قسم کا دانشور نقاد اپنے قاری کو اس بصیرت اور اس لطف میں شریک کرنا چاہتا ہے جو اسے ادب سے حاصل ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہ نکالا جائے کہ وہ تاثراتی تنقید لکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاثراتی تنقید اور دانشورانہ تنقید میں بعد المشرقین ہے۔ تاثراتی تنقید غیر ذمہ دار اور من کی موج کی تابع ہوتی ہے حتی کہ مظہریاتی یعنی Phenomenological تنقید بھی محض من کی موج ہوتی ہے۔ ایک وقت وہ آتا ہے جب ایسے نقاد کا رشتہ اس فن پارے سے کم و بیش ٹوٹ جاتا ہے جس کا

مطالعہ اسے مقصود تھا اور جس کی خوبیاں یا بصیرتیں وہ ہم تک پہنچانا چاہتا تھا۔ رومن انگارڈن (Roman ingarden) کہتا ہے کہ فن پارہ اصلاً ایک تجریدی شے ہے، اس کا حقیقی وجود تب ہوتا ہے جب کوئی قاری اسے اپنے شعور کا حصہ بناتا یعنی اسے concretize کرتا ہے۔ ٹھوس بنانے کے اس عمل میں قاری اپنے شعور (consciousness) اور اس شعور کے ہدف، یعنی فن پارے، کا مطالعہ بیک وقت کرتا ہے۔ لہٰذا تنقید کا کام نہ تو یہ ہے کہ وہ فن پارے کا مطالعہ بطور شے کرے، اور نہ یہ کہ وہ محض قاری کے تاثرات تک خود کو محدود رکھے۔ قاری نہ تو خالص فاعل (subject) ہے، اور نہ فن پارہ خالص شے (object)۔ فن پارہ اس وقت ٹھوس شکل اختیار کرتا ہے جب اسے کسی شعور (consciousness) سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان خیالات پر کروچے (Croce) کا اثر دریافت کرنا مشکل نہیں، کہ دونوں ہی نظامِ فکر فن پارے کے وجود کو کسی فاعل کا تابع قرار دیتے ہیں، لیکن کروچے کے برخلاف رومن انگارڈن اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ جب شعور مختلف ہوں گے تو فن پارہ کسی واحد، سالم، اقتدار دار (authoritative) وجود سے محروم ہوگا، بلکہ ہر شعور اس پر اپنے ہی طور پر concretization کا عمل کرے گا۔

اس مختصر تجزیے کی روشنی میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مظہریاتی تنقید آخر کار سستی تاثراتی تنقید سے بہت دور نہیں رہ جاتی، کیوں کہ اگر فن پارے کا کوئی واحد، سالم وجود نہیں ہے تو کسی فن پارے کے بارے میں کوئی بھی قاری کوئی بھی تاثر بیان کر سکتا ہے۔ منطقی اعتبار سے وہ تاثر بہر حال درست ہی کہا جائے گا۔ کسی فن پارے کے بارے میں مظہریاتی بیان کی صحت کی ضمانت کے طور پر اس پر کتنی ہی شرطیں کیوں نہ عائد کی جائیں، لیکن ہر شرط بہر حال اس منطق کی تابع ہوگی کہ فن پارہ ایک وجود تو رکھتا ہے، لیکن وہ عینی اور تجریدی وجود ہے۔ اسے ٹھوس شکل دینے کے لئے قاری کا شعور درکار ہے اور قاری کے شعور پر رومن انگارڈن ایسی کوئی شرط نہیں لگاتا جیسی کہ مثال کے طور پر ہم آنندوردھن کے یہاں سہردیہ قاری کے بیان میں دیکھتے ہیں۔

لہٰذا وہ نقاد جو قاری کو اپنی بصیرت اور ادب سے حاصل کردہ لطف میں شریک کرتا ہے، تاثراتی نقاد نہیں ہو سکتا۔ وہ دانشور نقاد ہو گا، اور اس کی دانش کی جڑیں تعقلاتی فکر کی زمین میں دور تک پھیلی ہوئی ہوں گی۔ اس کی مثال دیکھنا ہو تو سرور صاحب کا مضمون اکبر الہ آبادی پر پڑھئے جو ان کی کتاب "کچھ خطبے کچھ مقالے" میں شامل ہے۔ نہ صرف تعلیم اور فکری منہاج کے اعتبار سے، بلکہ خود مزاج کے اعتبار سے سرور صاحب کی روشن خیالی اور اکبر الہ آبادی کی قدامت پسندی، بلکہ قدامت پرستی، کے درمیان کوئی مفاہمت بظاہر ممکن نہیں۔ دوسرے نقادوں، مثلاً مجتبیٰ حسین اور وقار عظیم کے ساتھ عام طور پر یہی ہوا بھی ہے کہ وہ ہزار ہمدردی کے باوجود اکبر کی قدامت پرست فکر کے ساتھ مثبت معاملہ نہ کر سکے۔ وقار عظیم نے اکبر کی شاعری کو مصلحانہ کہا ہے۔ یہ محل نظر تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وقار عظیم اگرچہ اکبر کے اصلاحی ایجنڈا کے ہم نوا ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کی مصلحانہ مساعی میں انھیں ایک طرح کی غیر ذمہ دارانہ فضا نظر آتی ہے۔ وقار عظیم کہتے ہیں:

> مغرب کے خمار خانے میں جس قدر سامان تھا اسے اکبر کی نگاہیں کبھی پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس لئے انھوں نے ٹھکرا ٹھکرا کر ان بلوری جاموں کو چکنا چور کر دیا۔ اس بادۂ گلفام سے ہولی کھیلی اور ان مستانہ وار رنگ رلیوں میں جو کچھ جی میں آیا کہا۔

وقار عظیم نے بے ارادہ طور پر مزاحیہ اختیار کر لیا ہے، ورنہ وہ اکبر کے مزاح پر ہنسنے کے قائل نہیں، اس پر عمل کرنے کے قائل ہیں۔ مجتبیٰ حسین میں حس مزاح کی کمی ہے اس لئے وہ اصل اور فرع کو خلط ملط کر کے اکبر پر یوں برسے ہیں:

> انھوں (اکبر الہ آبادی) نے ریل، تار، ڈاک، ٹائپ، اور پائپ سے لے کر لڑکیوں کی تعلیم تک کا مذاق اڑایا ہے...... یہ مخالفت صرف برطانوی سامراج کی وجہ سے ہوتی تو ایک حد تک سمجھ میں بھی

آجاتی مگر یہ زمانے کی تیز رفتاری کی مخالفت تھی، سائنس اور اس کے جدید انکشافات اور نظریات کی مخالفت تھی۔ بات یہ ہے کہ اکبر کی شاعری میں بھی ایک "ملاّ" چھپا ہوا بیٹھا ہے۔

کہنا پڑتا ہے مجتبیٰ حسین بھی غیر شعوری طور پر مزاحیہ تحریر لکھ گئے ہیں۔

اب آل احمد سرور کا تجزیہ ملاحظہ ہو۔ انھیں ان تمام باتوں کا احساس ہے جن کا دھندلا یا واضح احساس وقار عظیم اور مجتبیٰ حسین کو تھا لیکن سرور صاحب ان باتوں کو ایک دانشور کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

اکبر کوئی مفکر نہیں تھے۔ ان کے یہاں دانشور کا ذہن نہ ملے گا۔ وہ ایک ایسے شاعر تھے جو اپنی مشرقی تہذیب کے عاشق تھے۔ اس تہذیب میں خوبیاں بھی تھیں اور خامیاں بھی۔ مگر اکبر کو اس کی خوبیاں ہی نہیں، خامیاں بھی عزیز تھیں۔ یہ جاگیردارانہ تہذیب تھی مگر اس میں انسانی رشتے بہت گہرے تھے۔ اس میں زندگی کی بہاروں، حسن فطرت، سب کا احساس تھا۔ مذہب نے کچھ خانے بنا رکھے تھے، مگر ایک رواداری بھی عطا کی تھی۔ مذہبیت کے باوجود یہ کٹرپن کے خلاف تھی......

...... بنگال سے راجہ رام موہن رائے کی قیادت میں ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کی جو رو شروع ہوئی اس نے مذہبی اصلاح، علوم کی بازیافت اور انگریزی تعلیم تینوں پہلوؤں پر توجہ کی۔ مگر جلد ہی یہ مغربی تعلیم، سرکاری ملازمت کی جدوجہد اور مغرب کی ذہنی غلامی پر توجہ کرنے لگی۔ عقلیت اور مغرب کے سائنسی مزاج کو اپنانے کی سعی، مغرب پرستی اور مشرق کی ہر چیز سے بیزاری کا روپ دھارنے لگی...... سرسید...... کی نظر بھی وکٹورین عہد کے انگلستان کی جگمگاہٹ سے خیرہ ہو گئی۔

......اکبر کے مطالعے میں یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہئے کہ...... جہاں وہ واعظ و ناصح، خطیب و پیام بر ہیں، وہاں ان کا پیام وقتی ہے۔ مگر یہی بات جب وطنز و مزاج کے پردے میں کہتے ہیں تو پیام پر نظر نہیں جاتی بلکہ ہم ان کے خیالات کی رنگینی اور الفاظ کے طلسم محو ہو جاتے ہیں...... فن ایک ایسی تنظیم ہے جو اپنی منطق اور اپنی صداقت رکھتی ہے...... فن وہ صداقتیں دیکھتا ہے جو پیام کی پکڑ میں نہیں آتیں......وہ آنکھ بند کر کے ہر طوفان کا خیر مقدم نہیں کرتا۔ وہ اس کے پیچھے تباہی کو بھی دیکھ لیتا ہے۔ فن کار اکبر کی معنویت کا یہی راز ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ آل احمد سرور کو اکبر کے پیغام سے کچھ بہت زیادہ ہمدردی نہیں، اس معاملے میں مجموعی طور پر مجتبیٰ حسین کا اور سرور صاحب کا موقف ایک ہے۔ اکبر کے ناصحانہ کردار کا اقرار کرنے کے باوجود سرور صاحب کے یہاں وقار عظیم جیسا مدافعانہ (apologetic) لہجہ بھی نہیں ہے۔ سرور صاحب کا دانشورانہ رویہ انھیں کلام اکبر کی خوبیوں اور پیام اکبر کی خرابیوں پر یکساں حاوی کر دیتا ہے اور ان کے یہاں وہ تاریخی اور تہذیبی شعور بھی ہے جس کی مدد سے انھیں اکبر کے سیاسی کجدار مریز اور ان کے تہذیبی المیے کے ان تمام گوشوں تک رسائی ہو جاتی ہے جہاں کم تر دماغوں کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اور ایک دوسری بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ سرور صاحب نے اکبر کی طنزیہ مزاحیہ شاعری کا جو تجزیہ اور جواز پیش کیا ہے وہ دوسرے طنزیہ شعرا اور دوسری طنزیہ نظموں، مثلاً ڈرائڈن (Dryden) کی میک فلیکنو (Macflecknoe) یا بائرن کی English Bards and Scotch Reviewers پر جاری نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ سرور صاحب کی دانشوری میں تھوڑی رومانیت بھی ہے۔ یہ رومانیت نقاد کے دل کو پاسبان عقل کی رقابت سے کبھی کبھی آزاد کر دیتی ہے۔ اور آج کے عہد میں، جب تنقید میں ادب سے محبت کی جگہ ادب سے نبرد آزما ہونے کا

رجحان دکھائی دینے لگا ہے، یہ رومانیت کچھ زیادہ ہی ضروری ہو گئی ہے۔ رومانیت کا خاصہ ہے کہ وہ ذاتی اور قبیلہ جاتی مفادات سے ماورا ہو جانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ اسی کی بدولت سرور صاحب ایسی بات کہہ سکے جو آج کے نقادوں کے عام طریق کار کے خلاف جاتی ہے:

> ہماری پرانی تنقید میں خواص پسندی تھی تو نو آبادیاتی تنقید اس ہمدردی سے محروم تھی جو ترجمانی یا فن شناسی یا تحسین کے لئے ضروری ہے...... ادب کی تنقید ادب سے ہمدردی اور محبت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ یہ محبت ایک عرفان عطا کرتی ہے...... یہ تخلیق کے تجربے میں قاری کو شریک کر کے فن کار کے روحانی سفر میں ساتھی بن کر پھر اس سفر کی اہمیت اور سمت کو واضح کرتی ہے۔

سرور صاحب کی عمر اس وقت نوے سے متجاوز ہے۔ کار جہاں کے بے ثبات ہونے کا احساس جب میری عمر کے لوگوں کو اس قدر شدت سے ہے تو انھیں یہ احساس ہم لوگوں سے بہت زیادہ ہوگا۔ لیکن انھیں ایک چیز نصیب ہے جو کم از کم مجھے ابھی نصیب نہیں۔ اللہ ان کا سایہ ہم پر تادیر قائم رکھے، وہ ساٹھ، پینسٹھ برس پر محیط اپنے سفر کو مڑ کر دیکھیں تو بے تکلف کہہ سکتے ہیں:

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اور میرے لئے اس سے کچھ بہتر نہیں کہ شہزادہ دارا شکوہ قادری کی زبان میں سرور صاحب کو خراج عقیدت پیش کر کے آپ سے رخصت لوں۔

عارف دل و جان ما مزین سازد
خارے کہ کند زپاش گلشن سازد
کامل ہمہ را ز نقص بیروں آرد
یک شمع ہزار شمع روشن سازد

☆☆☆